جناب اختر راہی بی۔ اے

قسط اوّل

اسلام کا سیاسی نظام

ایک تعارف

اسلام کے سیاسی نظام میں "اقتدارِ اعلیٰ" کا تصوّر مرکزی اہمیّت کا حامل ہے۔ یہی وہ محور ہے جس کے گرد اسلامی ریاست کا نظامِ حکومت گردش کرتا ہے۔ ریاست کی تعریف کے مطابق "اقتدارِ اعلیٰ" کے بغیر کوئی آبادی محض کسی خطۂ ارض پر بود و باش سے "ریاست" نہیں کہلا سکتی جدید و قدیم مفکّرینِ سیاست نے "اقتدارِ اعلیٰ" کے تعیّن میں ذہنی کاوشیں کی ہیں اور ان میں باہم اختلاف پایا جاتا ہے۔

شاہ پرستوں نے اس اختیار اور قوت کا سرچشمہ بادشاہ کی ذات کو قرار دیا ہے۔ شاہِ انگلستان کے بارے میں یہی تصوّر ہے کہ وہ معصوم عن الخطا ہے۔ اور زمانہ کبھی اس کے خلاف نہیں ہوتا۔ بعض قانونی ذہن رکھنے والوں نے "اقتدارِ اعلیٰ" کا تعیّن مجلسِ قانون ساز میں کیا ہے۔ اور جمہوریت پسندوں نے یہ عظیم قوت عوام کو سونپ دی ہے۔ تاہم اس اختلافِ نظر کے باوجود "اقتدارِ اعلیٰ" کی حامل ذات کے لئے مندرجہ ذیل اوصاف ضروری ہیں۔

۱۔ مطلق العنانیت (ABSOLUTENESS) اقتدارِ اعلیٰ کا ایک اہم اور بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ ایسا اختیار یا مرضی ہے جو سب سے فائق اور برتر ہوتا ہے اس کے استعمال پر کوئی شرط عائد نہیں کی جا سکتی۔ مقتدر ذات کا حکم تمام افراد اور اداروں کے لئے قابلِ اتباع ہوتا ہے۔ لیکن وہ خود کسی قانون یا ضابطے کی پابند نہیں ہوتی۔

۲۔ غیر تقسیم پذیری (INDIVISIBILITY) اقتدارِ اعلیٰ کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس اختیار و قوت کی حامل ذات ایک ہی ہوتی ہے۔ اس کے اختیارات میں کوئی شریک اور ساجھی نہیں

ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں مقتدر اعلیٰ ایک سالم و ثابت اکائی ہوتا ہے۔

۳۔ ہمہ گیری (UNIVERSALITY) مندرجہ بالا دو اوصاف سے ہمہ گیری کی خصوصیت بھی نکلتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ کا اختیار اور طاقت ریاست کے تمام افراد، اداروں انجمنوں اور اجتماعوں پر حاوی ہوتا ہے۔ کوئی شخص بھی مقتدر اعلیٰ کے قوانین کو چیلنج نہیں کر سکتا۔

۴۔ لازوال پذیری (PERMANENCE) مقتدر اعلیٰ کو کبھی زوال نہیں آتا وہ ہمیشہ قائم و دائم رہتا ہے۔ حکومت چلانے والے ہاتھ بدل سکتے ہیں اور آئے دن ان میں تبدیلی عمل میں آتی رہتی ہے۔ لیکن مقتدر اعلیٰ کی ذات لازوال ہے۔

۵۔ غیر انتقال پذیری (NOT TRANSFERABLE) اس وصف سے مراد یہ ہے کہ مقتدر اعلیٰ اپنے اقتدار اور اختیارات کسی اور حاکم کو منتقل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جونہی وہ ایسا کرے گا اس خصوصیت اقتدار کو کھو بیٹھے گا۔ اور جسے اقتدار و اختیار منتقل ہوگا وہی مقتدر بن جائیگا۔ اسطرح ایک درخت اپنے اگنے کا حق منتقل نہیں کر سکتا یا ایک انسان اپنے تباہ ہونے کے بغیر اپنی زندگی منتقل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مقتدر اعلیٰ کے اختیارات ناقابلِ انتقال ہیں۔

اقتدارِ اعلیٰ کے غیر انتقال پذیر ہونے کے وصف سے وابستہ ایک ضمنی خصوصیت ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ قانوناً ساقط نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عدمِ استعمال کی وجہ سے اقتضائے زمانہ سے یہ اختیار ضائع نہیں ہوتا۔

متذکرۃ الصدر اوصاف پر غور سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ یہ اوصاف کسی انسان یا انسانی گروہ میں نہیں پائے جا سکتے۔ انسان فانی ہے۔ اور زوال پذیر ہے۔ پھر انسان کے پاس ایسے ذرائع ہی نہیں ہیں جن کی مدد سے وہ ہر فرد کے افعال پر نگاہ رکھ سکے۔ مزید انسان کی مطلق العنانی معلوم! وہ تو حالات کا پابند اور غلام ہے اور حالات ہی اس کے طرزِ عمل کا تعین کرتے ہیں۔

انسانی فکر و خیال نے یہ تو معلوم کر لیا کہ "اقتدارِ اعلیٰ" کی حامل ہستی کے لئے یہ اوصاف لازمی و لابدی ہیں۔ لیکن محدود اور ناقص عقل اس اعلیٰ ہستی کا تعین کرنے میں ناکام رہی۔ یہ خصوصیات صرف ذاتِ خداوندی ہی میں پائی جاتی ہیں۔ وہی واحد ہے۔ اس کی صفت "فعال لما یرید" ہے۔ اور اسی کی ذات "علیم بالذات الصدور" ہے۔ اور حی و قیوم اسی کی ذات بابرکات ہے۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے اقتدارِ اعلیٰ کا مالک کوئی فرد، قبیلہ یا بحیثیت مجموعی پوری امت مسلمہ بھی نہیں ہے، بلکہ اس منصب کی حامل صرف اور صرف "اللہ تعالیٰ" کی ذات ستودہ صفات ہی ہے۔ قرآنِ کریم کی آیات اس پر دال ہیں۔

۱۔ ان الحکم الا للہ۔

حکم اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔

قل ان الامر کلہ للہ۔

۲۔ کہو اختیار سارے کا سارا اللہ ہی کا ہے

الا لہ الخلق والامر۔

۳۔ خبردار اسی کی خلق ہے اور امر۔

ان آیات سے واضح ہے کہ اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور اطاعت خالصۃً اسی کے لئے ہے۔ یہ بات اس امر کا منطقی نتیجہ ہے۔ کہ خدا ہی نے انسان کو پیدا کیا اور وہ ہی اس کی حدود متعین کرنے کا مختار ہے۔ لہذا قانونی حاکمیت خدا کی ذات سے مخصوص ہے۔

انبیائے کرام اسی "اقتدارِ اعلیٰ" کی طرف سے انسانوں تک قوانینِ حیات پہنچاتے رہے ہیں۔ اس حیثیت سے وہ قانونی حاکمیت کے نمائندے تھے۔ اور اس بنا پر ان کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہے کہ اس کے نمائندوں کے احکام (امر و نہی) کی پیروی کی جائے اور ان کے فیصلوں کو بلا چون وچرا مان لیا جائے۔ حتیٰ کہ رسول کے دل میں ناگواری کا احساس تک پیدا نہ ہو۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط

۱۔ ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ط

۲۔ اور جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

۳۔ جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے روک دے اس سے باز آجاؤ۔

انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کے قوانین اور اصولوں کو اپنی زندگی میں برت کر انسانوں کیلئے ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک عملی نمونہ پیش کر کے انسانوں کو راہ راست دکھا دیتے ہیں۔ مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ انبیائے کرام اللہ کی مرضی ہی کے مظہر ہوتے ہیں۔

اسلامی تصورِ حاکمیت کے پیشِ نظر اسلام کا سیاسی نظام مغرب کے جمہوری نظام سے واضح طور پر مختلف ہے۔ مغربی جمہوری نظام کے اماموں نے "اقتدارِ اعلیٰ" کا منصب عوام کو سونپ دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عوام اپنا لائحہ زندگی مرتب کرنے میں بالکل آزاد ہیں۔ وہ کسی چیز کو آج حرام اور کل حلال قرار دے سکتے ہیں۔ وہ کسی اخلاقی اور قانونی ضابطے کے پابند نہیں ہیں۔ جس چیز کو چاہیں اپنا لیں، اور جب چاہیں اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیں۔ ان کا اختیار و ترک ہی قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی ریاست نے اپنے شہریوں کو یہ اختیار نہیں دیا تاکہ انسان اپنی ناقص عقل اور محدود بصیرت سے غلط راستہ اختیار کر کے معاشرے کو تباہ نہ کر دے۔

بعض لوگوں کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے مقتدرِ اعلیٰ ہونے پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ واضح حدود مقرر کر کے درحقیقت انسان کے ذہن کو جکڑ دیا گیا ہے اور اسے ایک پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے جس سے باہر وہ کسی امر پہ سوچ ہی نہیں سکتا۔ ظاہر ہے یہ غلط فہمی سطحی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ "حدود" اس باڑ کی حیثیت رکھتی ہیں جو پہاڑی راستوں کے دونوں طرف لگا دی جاتی ہیں۔ یہ باڑ انسانی راہ کو روکنے کے لئے نہیں بلکہ اُسے راہ راست پر رکھنے اور گہری کھائیوں میں گرنے سے بچانے کی خاطر لگائی گئی ہوتی ہیں۔ اسلام کی عائد کردہ حدود بھی انسانی زندگی کو ہموار رکھنے کے لئے ضروری ہیں اور انہیں پھلانگ دینا کسی صورت موزوں نہیں۔ مغربی جمہوریت کے خالقوں نے "اقتدارِ اعلیٰ" کی قوت عوام اور عوامی نمائندوں کو سونپ کر اس کا جو ثمر حاصل کیا مندرجہ ذیل دو واقعات سے نمایاں اور عیاں ہے۔

۱۹۱۷ء میں شراب کی مضرت اور تباہی کے پیشِ نظر امریکہ کی کانگریس نے شراب سازی، شراب فروشی اور شراب نوشی کو قانوناً جرم قرار دیدیا۔ کانگریس کا یہ حکم ڈاکٹروں کے سالہا سال کے تجربے اور ماہرین نفسیات و اخلاقیات کے مطالعہ و مشاہدہ کے بعد نافذ کیا گیا تھا۔ جب یہ قانون نافذ ہوا تو بظاہر تو شراب نوشی و شراب فروشی بند ہو گئی لیکن یہ

کاروبار زیر زمین شروع ہوگیا۔ ظاہر ہے جس قوم کے منہ یہ "کافر" لگ چکی تھی محض ایک "قانون" بنانے سے نہیں چھڑائی جاسکتی تھی۔ پہلے سے زیادہ شراب بنی اور استعمال ہوئی اس پر مستزاد گھٹیا ہونے کی وجہ سے ہزاروں نوجوان اس کے مضر اثرات سے متاثر ہوئے آخر وہی کانگریس جس نے سولہ سال پہلے شراب نوشی اور شراب فروشی کو ممنوع قرار دیا تھا ۱۹۳۳ء میں مجبور ہوگئی کہ قوم کو اس زہر نوشی کی اجازت دے دے۔ یہ نظر ثانی اس لئے کی گئی تھی کہ تجربہ و تحقیق سے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ شراب مضر ہونے کی بجائے مفید صحت ہے بلکہ صرف اس لئے کل کا "حرام" آج "حلال" بن گیا کہ قوم اپنے اوپر یہ پابندی عائد کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

مغربی دنیا میں بڑھتی ہوئی بد اخلاقی اور جنسی انارکی اس امر کا زندہ ثبوت ہے۔ ہم جنسی (HOMOSEXUALITY) کو فطری خواہش قرار دیدیا گیا اور کوشش کی جارہی ہے کہ اس فعل بد کو جرائم کی فہرست ہی سے خارج کر دیا جائے۔ ہالینڈ میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک گرجا میں فاعل و مفعول کا باقاعدہ نکاح پڑھا گیا اور یہ فریضہ ایک پادری نے انجام دیا۔ یہ ہے انسان کے بے بہا اختیارات کا استعمال اور ان کا ثمر۔ اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کو رد کرکے انسان کو "مطلق العنان" اختیارات سونپنے کا نتیجہ۔ اگر اس پر انسانیت شرم سے سر نہ جھکائے تو کیا کرے۔؟

اسلام کی سیاسی تعلیمات کی رو سے حکومت کی صحیح صورت یہ ہے کہ ریاست خدا کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرکے اس کے حق میں قانونی بالادستی سے دستبردار ہوجائے اور حاکم حقیقی کے سامنے "خلافت" کی حیثیت قبول کرے۔ یعنی انسانی ریاست تمام اختیارات میں چاہے وہ انتظامی ہوں یا عدالتی، تشریعی ہوں یا دوسرے۔ اللہ تعالیٰ کی حدود کی پابند ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے تمکن فی الارض کا وعدہ کرتے ہوئے "خلافت" ہی کو مقصد قرار دیا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ (النور - ۵۵)

اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ہیں، کہ وہ انہیں زمین میں خلافت دے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی۔

مندرجہ بالا آیت پر غور و فکر سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی خاص فرد، خاندان یا قبیلے کو خلافت کے لئے مختص نہیں کیا بلکہ یہ خلافت بحیثیت مجموعی جماعت کو حاصل ہے۔ اور امتِ مسلمہ کا ہر فرد اس خلافت میں برابر کا حصہ دار ہے، کسی طبقہ یا فرد کو خلافت اجتماعی کے اختیارات کو سلب کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ کوئی حقوقِ ربانی (DIVINE RIGHTS OF KING) کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

ظاہر ہے کہ امتِ مسلمہ اپنے کاروبارِ حیات اور سیاسی قوت کے استعمال کے لئے ایک فرد کو اپنا سربراہ چنے گی اور سربراہ کا انتخاب نہایت ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے کہ "مسلمانوں کے لئے جامع شرائط خلیفہ کا تقرر واجب ہے اور یہ حکم تا قیامت ہے" ازالۃ الخفا مقصد اول فصل اول۔

امتِ مسلمہ کا یہ سربراہ "خلیفہ" کہلاتا ہے۔ خلیفہ کا لغوی مفہوم "جانشین" یا "نائب" کا ہے۔ قرآن میں بقرہ : ۳۱ الاعراف : ۶۹، ۷۴، ۱۲۹ اور فاطر : ۳۹ میں ان ہی معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

اسلامی تاریخ میں خلیفہ کو مختلف اضافتوں اور ناموں سے پکارا گیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو "خلیفہ رسول اللہ" کہا جاتا تھا۔ اور حضرت عمر فاروقؓ کو "خلیفہ رسول اللہ" کہا گیا۔ اس تواترِ اضافت سے بچنے کے لئے حضرت عمرؓ نے "امیر المومنین" کا لقب اختیار کیا۔ اس سے پہلے عرب "امیر" قائدِ جیش کو کہتے تھے۔ حسن ابراہیم حسن کے بیان کے مطابق عہدِ فاروقی کی فتوحات اور اعلیٰ نظم و نسق کے پیشِ نظر یہ لقب ہر لحاظ سے درست ہے۔ خلیفہ کے لئے "امام" کا لفظ بھی مستعمل رہا ہے۔ امام کا مادہ " ا، م " ہے اور لفظی مطلب شاقول کا وہ دھاگہ ہے جس سے معمار دیوار سیدھی کرتے ہیں۔ لیکن اصطلاحاً خلیفہ کے لئے یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ تاہم تاریخی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ کس خلیفہ نے اپنے آپ کو امام کے لقب سے ملقب کیا۔ بلکہ یہ لفظ ان لوگوں کے لئے مخصوص ہو گیا جو خاندانِ علیؓ کے چشم و چراغ تھے اور مسلمانوں کا ایک گروہ انہیں خلافت کا سب سے زیادہ اہل سمجھتا تھا۔

اثر، کے مادہ ... امام ... ان ... میں ... سے بھی "امام" کا لقب مستعمل ہے

جنہوں نے علم وفضل میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا نیز نماز کی قیادت کرنے والا شخص بھی "امام" ہی کہلاتا ہے۔

آرنلڈ کا خیال ہے اگرچہ قرآن حکیم میں "خلیفہ" اور "امام" کا لفظ مستعمل ہے لیکن اس سے فقہاء نے جو مروّج مفہوم اخذ کیا ہے۔ اس استنباط کی حیثیت وہی ہے جیسے مسیحی علماء نے کلیسائی اور شاہی اغراض کی خاطر انجیل سے استناد و استنباط کیا تھا۔ خلیفہ کے لفظ سے اسلام کے نظام سیاست کے وجود پر استدلال ناممکن ہے۔

آرنلڈ کی یہ رائے چنداں درست نہیں بلکہ حقائق کے یک طرفہ مطالعہ کا ثبوت ہے۔ آرنلڈ نے قرآن کی سیاسی تعلیمات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث سے اغماض برتا ہے جو اس ضمن میں قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ ان ہی نصوص قطعیہ کی روشنی میں فقہاء نے کلام کیا ہے۔ آرنلڈ ان احادیث کو یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ:

"جب حکومت کی شکل بدل گئی تو فقہاء نے حکومت کے جواز میں آنحضرتؐ کی طرف ایسے بیانات منسوب کرنے شروع کر دئے جو کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔"

اس مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آرنلڈ صاحب نے عام غیر مسلم مستشرقین کیطرح پہلے ایک رائے قائم کی ہے۔ اور پھر اس کے خلاف جو کچھ بھی ملا اسے "بعد کی پیداوار" کہہ کر رد کر دیا۔ ان کا فقہاء کی تحقیق و استنباط کو مسیحی پادریوں کی سعی لاحاصل جیسا قرار دینا بھی قرآن اور بائبل کی حیثیت کو ایک سطح پر تصوّر کرنے کا نتیجہ ہے۔ جبکہ قرآن میں واضح سیاسی تعلیمات موجود ہیں۔ اور انجیل ایسی تعلیمات سے یکسر خالی ہے۔ ■■

ادارہ عالیہ تنظیم المساجد نے اسلام آباد میں ایک مدرسہ عربیہ اسلامیہ قائم کیا ہے، مدرسہ میں ابتدائی طور پر صرف دس طلباء درجہ اوّل۔ دوئم۔ سوئم میں داخل کئے جائیں گے۔ داخلہ کے امیدواروں کا امتحان لیا جائے گا۔ کوئی امیدوار بارہ سال سے کم عمر کا داخل نہ کیا جائے گا۔ خورد و نوش و رہائش کا انتظام ادارہ کے ذمہ ہوگا۔

——— پتہ ذیل پر رابطہ قائم کریں ———

مدرسہ اسلامیہ عربیہ محرفت مدنی مسجد شالیمار ۲/۱ اسلام آباد